بسم اللہ الرحمن الرحیم

وقت کا اہم ترین سوال

اِسلامی نظامِ حکومت

کس قسم کا ہوگا!

اسلامی نظامِ حکومت

آجکل اس سوال کا چرچا عام ہو رہا ہے کہ اسلامی مملکت کے نظامِ حکومت کا ڈھانچہ کس قسم کا ہوگا۔ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی سوالنامہ بھی جاری ہوا ہے۔ ہمیں وہ سوالنامہ تو موصول نہیں ہوا لیکن قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی طرف سے ہمیں کہا جا رہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں اس ڈھانچے کے خط و خال نمایاں کئے جائیں۔ یہ سطور انہی تقاضوں کی تعمیل میں سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے اسلامی مملکت قرآنی قوانین کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس لئے اس باب میں پہلا اور بنیادی سوال قانون سازی کا ہوگا۔ ہم پہلے اسی سوال کو لیتے ہیں۔ بعد میں بتایا جائیگا کہ ان قوانین کے وضع اور نافذ کرنے کی مشینری کس قسم کی ہوگی۔ اسی کو اسلامی حکومت کہا جائے گا۔

(۱)

انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے مل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے متنازع فیہ معاملہ میں تصفیہ کرے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے، وہ عام معاشرہ میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا جسے نظامِ حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پنچایت کی سی تھی لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی باقاعدہ ثالث کی ضرورت پیش آئی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قولِ فیصل قرار پاتا تھا اور اس کی نافرمانبرداری مستوجبِ سزا ہوتی تھی۔ بالفاظِ دیگر اس میں جملہ افرادِ معاشرہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کے محکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلا نہ جائے وہ کارفرما رہے۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ جو ہم نظامِ حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں تو یہ درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے جس کی رُو سے وہ طے کرتا تھا کہ قانون سازی کے اختیارات کسے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل نظامِ جمہوریت ہے۔ لیکن عہدِ کہن کی شخصی حکومت ہو یا عصرِ حاضر کی جمہوریت، اس میں انسان بہرحال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترامِ انسانیت اور شرفِ آدمیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔

قرآن کا انقلابی تصور

اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا حکم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون۔ بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترامِ آدمیت کے منافی ہے۔ اس نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اسے ضابطۂ قوانین، اختیارِ حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے، کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ شرفِ انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالا کسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کریں انہیں مؤمن — یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں صرف خدا کو حاصل ہے۔

کتاب اللہ کی حاکمیت

اس ایمان باللہ کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ہمیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اپنے کانوں سے اس کی بات سن سکتے ہیں تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کا جواب خدا نے اسی آیت ..... میں دے دیا جس کا آدھا حصہ ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے:۔

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

نہیں کسی انسان کی محکومیت اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیئے اور اس کا ذریعہ وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا ہے۔ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو۔

آپ غور کیجیئے کہ قرآنِ کریم نے کیسے بلیغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا قابلِ عمل طریقہ کیا ہے۔ آپ غور کیجیئے کہ آج، اس دور میں، جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زمانہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں۔ کوئی اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ غور کیجیئے کہ قرآنِ کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب (ضابطۂ قوانین) کی ہوتی ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحبِ کتاب خود ہمارے سامنے آکر حکم دے تو پھر ہی اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہٰذا، اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اس کی کتاب کی اطاعت ہے، اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان نہیں لاتا، اس کا خدا پر ایمان لانا بھی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتا وہ خدا کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر کہلاتے ہیں۔

(۳) جس کتاب کی محکومیت اختیار کی جائے مقصود ہو یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس میں کوئی ابہام نہ ہو۔ کسی قسم کا التباس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔۔۔۔ (۱۶/۸۹)

اے رسول! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔

(۴) خدا کی اس محکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ اُن (ابتدائی) ادوار میں نہ انسانی ذہنوں میں ہنوز پختگی آئی تھی، نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تھی، اس لئے انہیں زیادہ تر وقتی اور عارضی احکام دیئے جاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف جلدی جلدی رسول بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت کے پروگرام کے تحت انسانیت پختگی کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہیئے کہ جب بچہ جوان ہو گیا) تو خدا کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ آئین و قوانین نازل کر دیا گیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے بھی کافی ہو اور آنے والے تمام زمانوں کے تقاضوں کو بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہو اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ :۔

آخری کتاب

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔۔۔۔ (۶/۱۱۲)

تیرے رب نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ یہ ضابطۂ قوانین اس خدا کی طرف سے نازل کردہ ہے جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی اس ضابطۂ قوانین میں نہ کسی اضافے کی ضرورت ہو گی اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس کے بعد ایک ہی سوال باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کسی وقت یہ کتاب حوادثِ ارضی و سماوی سے ناپید ہو گئی، یا اس میں کسی نے تحریف کر دی، تو پھر کیا صورت ہو گی۔ فرمایا کہ اس کا امکان ہی نہیں، اس لئے کہ :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (۱۵/۹)

ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اس میں نہ تحریف ہو سکے گی اور نہ ہی یہ ضائع ہو گی۔

یعنی قرآن مجید خدا کا مکمل ضابطۂ قوانین ہے جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور یہ غیر محرف بھی رہے گا اور محفوظ بھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے بعد خدا کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی — ختمِ نبوت اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ تھا۔

(۵) ہم نے دیکھا ہے کہ دین، مذہب کی طرح خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ عقیدے کا نام نہیں جو انسانوں

کے خود ساختہ تصور کی رو سے پوجا پاٹ، بھگتی یا پرستش کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ دین انسانوں کی اجتماعی نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس میں خدا کی کتاب کی حکومت اختیار کی جائے۔ جب ہم نظامِ زندگی یا حاکمیت اور حکومت کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے لازماً ایک نظامِ حکومت یا مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ مملکت کے بغیر کسی کتاب کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس

مملکت کی ضرورت

حقیقت کو قرآنِ مجید نے یہ کہہ کر خود واضح کر دیا کہ دین کا تمکن اسی صورت میں ممکن ہے جب دین کے ماننے والوں کو ملک میں تمکن حاصل ہو۔ سورۃ النور میں ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ (۲۴/۵۵)

جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور صلاحیت بخش کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا کرے گا جس طرح اقوامِ سابقہ کی صورت میں کیا گیا تھا تاکہ اس طرح وہ دین متمکن ہو سکے جسے اس نے ان کے لئے منتخب کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ جماعتِ مؤمنین کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا تمکن ممکن ہی نہیں، بات بالکل واضح ہے۔ دین کے تمکن کے معنی ہیں کتاب اللہ کی حکومت قائم ہونا اور حکومت لامحالہ اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے! —— آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ آئینِ پاکستان اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب مملکتِ پاکستان موجود ہو۔

ضمناً، مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس مملکت میں دین کا تمکن مقصود ہو، وہ ظلم اور استبداد، دھاندلی اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ وہ خدا کی حاکمیت پر ایمان اور اس کے مطابق صلاحیت بخش پروگرام کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ دین کا تمکن —— یعنی کتاب اللہ کی حکومت —— اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے۔ سورہ الحج میں ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ —— (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے جن امور کو کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہے انہیں حکماً نافذ کریں گے۔ جنہیں اس نے ناجائز ٹھہرایا ہے ان پر پابندی عائد کریں گے۔ مختصراً یہ کہ ان کا ہر معاملہ انجام کار خدا کے قوانین کے مطابق طے پائے گا۔

اس مقام پر ایک بڑا اہم اور غور طلب نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے قرآنِ مجید کی سورتوں کو مکی اور مدنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کے معیارِ تقسیم کے متعلق تو سردست کوئی بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اس اہم حقیقت

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ مکی آیات کی سورتوں میں کہیں "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (اے جماعتِ مومنین) نہیں آیا..... یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ۔ (اے لوگو!) ہی آیا ہے۔ "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" مدنی آیات ہی میں آیا ہے۔ مکی زندگی میں اکثر حضرات اسلام لے آئے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی ہنوز انفرادی تھی اس لئے انہیں "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب انہیں اقتدار حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنی مملکت قائم کر لی تو اس وقت "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے مخاطب

کے اہل قرار پاتے۔ اس سے واضح ہے کہ اربابِ ایمان "یا ایھا الذین آمنوا" کہہ کر پکارے جانے کے سزاوار اُس وقت ہوتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ کتاب اللہ کی حکومت قائم کر سکیں۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، خدا پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ "جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے"۔

سب سے پہلے اس قسم کی مملکت نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں مدینے میں قائم ہوئی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸)

اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اور وحیِ خداوندی نے حضورؐ کی لسانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۵)

اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے خوگر ہو چکے ہو) کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو (آیت ۵/۴۸ میں) کہا گیا تھا کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کرا دیا۔ بلکہ یہاں تک کہلا دیا کہ:

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔۔۔ (۶/۱۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانبرداری کروں تو ۔۔۔ اس کے عذابِ الیم سے ڈرتا ہوں۔

غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ کو مثال کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جڑ کاٹ کر رکھ دی۔!

(۷) یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں جسے الدین کہا جاتا ہے، حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں متعین احکام تھوڑے سے ہیں اور زندگی کے باقی معاملات کے متعلق صرف اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جنہیں "حدود اللہ" کہہ کر پکارا گیا ہے اور جماعتِ مومنین کا فریضہ ان حدود کا تحفظ قرار دیا گیا ہے۔

حُدُوْدُ اللّٰہ

(وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (۹/۱۱۲)) ان اصول و اقدار کو حدود کہنے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات اور آئینِ زندگی قرار پانا تھا، اسے ہونا ہی ایسا چاہیئے تھا کہ اس میں ابدی، مستقل، غیر متبدل حدود متعین کر دیئے جائیں۔ اور اس کتاب کی حاکمیت قائم کرنے والوں کو اس کی آزادی ہوتی کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین اور وقتی

احکام خود متعین کریں۔ یہ جزئی قوانین حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور خدا کی مقرر کردہ حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل رہیں گی۔ اگر اس کتاب میں جزئی قوانین بھی خود ہی متعین کر دیئے جاتے تو یہ کتاب عالمگیر انسانیت اور زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتی۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متغیر ہو نہیں سکتے۔

حدود اللہ کے علاوہ، قرآن مجید میں جو چند احکام آئے ہیں وہ بھی ابدی ہیں، لیکن ان کے متعلق قرآن کریم نے یہ حکمت ملحوظ رکھی ہے کہ جن حالات میں انہیں نافذ کیا جائے گا اور جس طریق سے ان پر عمل پیرا ہو جائے گا، انہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ اپنے حالات کی روشنی میں طریقِ کار کا تعین ہر دور کی قرآنی مملکت خود کرے گی۔

(۸) یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرما دیا کہ یہ کچھ جماعتِ مؤمنین کے باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ آپ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے

نظامِ مشاورت

نظامِ مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمتِ بالغہ ہے۔

ضمناً۔ آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظامِ جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظامِ مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظامِ مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ قرآن کے نظامِ حکومت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی عمل میں آسکتی ہے۔ لیکن مغربی نظامِ جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود اور قیود عائد نہیں ہوتے۔ اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پا جاتا ہے۔ یہاں ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔ سورۂ انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی آیت (۶/۱۱۵) جس میں یہ کہا گیا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔ اس کے ساتھ آیت (۶/۱۱۶) میں کہا گیا کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ ازاں بعد خدائے سمیع و علیم نے فرمایا:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۷)

اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جائے تو وہ تجھے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیگی۔ جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ خدائے سمیع و علیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظامِ جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔ بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کو اس قسم کے اختیارات کا حامل تسلیم کر لینا انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دینا ہے جو شرکِ عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کا حکم دیتا ہے۔

(۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ پہلی قرآنی مملکت رسول اللہؐ نے قائم فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹)

مملکت کے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا وہ احکامِ خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہی مجلسِ مشاورت

جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلسِ مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدود اللہ تو اپنے مقام پر محکم، اٹل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر و تبدل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوںؓ کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پائے ہوئے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ امتِ مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد پھر سے اُس نظامِ کہن کی طرف نہ پلٹ جانا جس میں خدا کے بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔ (۳/۱۴۴)

اسلامی مملکت کے عناصر

آگے بڑھنے سے پیشتر اس نظام یا مملکت کے بنیادی عناصرِ ترکیبی ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ یعنی :-

(۱) اُن لوگوں پر مشتمل ایک امت جن کا ایمان یہ تھا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی یہ حکومت اس کی کتاب کی رُو سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں نازل کردہ احکام و اصول و اقدار جنہیں حدود اللہ کہا جاتا ہے، ابدی اور غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین امت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۳) جو کچھ اس طرح طے پائے گا وہ اس حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ ان احکام کو احکامِ شریعت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس حکومت کے سوا کسی کو نہ کسی قسم کے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہوگا نہ نافذ کرنے کا اختیار۔

(۴) یہ احکام تمام افرادِ امت پر یکساں نافذ ہوں گے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوں گے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے اس امت میں نہ الگ الگ فرقے ہوں گے نہ ان فرقوں کے ایک دوسرے سے الگ قوانین۔ نہ ہی ان قوانین میں پرسنل لاز (شخصی قوانین) اور پبلک لاز (ملکی قوانین) کی تفریق و تخصیص ہوگی۔ نہ ان میں مختلف مقننین کا وجود ہوگا نہ ان کی مرتب کردہ الگ الگ فقہیں۔ ایک امت، ایک ضابطہ ہدایت، ایک مملکت اور اس کی طرف سے نافذ کردہ ایک ضابطہ قوانین۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے صدرِ اول کی کوئی مستند اور مصدقہ، بلکہ قابلِ اعتماد تاریخ ہمارے پاس نہیں۔ اُس دور کی سب سے پہلی جامع تاریخ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی جسے طبرستان کے ایک مؤرخ (امام طبری) نے کسی تحریری مواد کے بغیر زبانی روایات سے جمع اور مدوّن کیا۔ بنا بریں تاریخی طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ نظامِ مملکت کتنے عرصے تک قائم رہا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاء کرامؓ (جنہیں صحابہؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے دورِ حکومت تک یہ نظام قائم تھا کیونکہ اس امر کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وہ مومنِ حقہ تھے اور مومن حقہ انہی کو کہا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں۔ اس کے بعد بنو امیہ کے زمانے میں بھی دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے عہد میں امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا ـــــ اور دوسری بات یہ کہ اُس زمانے میں قرآن مجید کے سوا قانون (فقہ) کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے تک اُمت، امتِ واحدہ تھی۔ نہ اس میں مذہبی فرقے وجود میں آئے تھے نہ ان کی الگ فقہیں مرتب ہوئی تھیں۔ یہ کچھ ان کے بعد عباسیوں کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ (واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے بنی امیہ کے زمانے

کے متعلق لکھا ہے وہ ہمارا تاریخی اندازہ ہے جس کی صحت پر ہم اصرار نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اسے ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خاص تعلق ہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی نظامِ مملکت کچھ عرصے تک قائم رہا اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آگئی۔

(۰)

(۱۰) پہلے کہا جا چکا ہے کہ دین کا ممکن قرآنی نظامِ مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے۔ یہ نظام نہ رہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا۔ جب قرآنی نظامِ حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی (واضح رہے کہ ہر وہ حکومت جو امت کے مشورے کے بجائے قوت کے بل بوتے قائم ہو جائے ملوکیت کہلائیگی) اور جب وہ موروثی طور پر آگے چلے تو وہ ملوکیت کی بدترین شکل ہوگی جب مسلمانوں میں اس قسم کی حکومت قائم ہوگئی) تو دین باقی نہ رہا (کیونکہ مذہب نہیں رہا) اس کے بعد تاریخ کے اصل پورے دور میں (یعنی اس زمانے سے لیکر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوتی۔ ملوکیت نے سب سے پہلے ثنویت کی طرح ڈالی یعنی امورِ مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک لا کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین اربابِ مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ، امورِ مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیا کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اس تاثر کو ہمارے علماء کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں محراب و منبر سے ایدہ اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظل اللہ علی الارض "زمین پر خدا کا سایہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امورِ مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتویٰ سے لگا لیجئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب (ہدایہ اولین مجیدی۔ ص۴۹۳) میں ان الفاظ میں درج ہے:

موروثی بادشاہتیں

کل شیء صنعه الامام الذی لیس فوقه امام فلا حد علیه الا القصاص۔

یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے سربراہِ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا بجز قصاص کے۔ یعنی سربراہِ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی، اس لئے مختلف فقہاء نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے۔ اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امتِ واحدہ فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی:-

ائمہ فقہاء

(۱) امام اعظمؒ (کوفی) پیدائش ۸۰ھ، وفات ۱۵۰ھ
(۲) امام مالکؒ (یمنی، مدنی) پیدائش ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ
(۳) امام شافعیؒ (عسقلانی، مکی) پیدائش ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ
(۴) امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) پیدائش ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ

(اہلِ تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے)

شروع شروع میں تو ان ائمہ فقہا کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں۔ نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حک و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے خلاف ہو جس کا

فتویٰ اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مسلم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤول یا منسوخ ہے۔[1]

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اُس وقت تک کے دیئے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام فقہ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، امام ابوحنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہا کے فتاووں کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیرؒ کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔

مذہب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت ضرور تھی اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلد، ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ دین کا تمکن تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب قرآنی نظامِ مملکت باقی نہ رہا تھا۔

دینی نقطۂ نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کو درجۂ الوہیت[2] دے دیا گیا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہوگا۔ قرآنِ کریم نے سابقہ اہلِ کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۱)۔ کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآنِ کریم نے امت میں فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۳۰/۳۱)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اسکے متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے وضع کردہ عقائد و احکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال ابھرا کہ مروجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ:

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمۂ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے ..... لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور منقح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلاضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امتِ محمدیہ کا

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی۔ مؤلفہ علامہ محمد الخضری کا اردو ترجمہ۔ "تاریخ فقہ اسلامی"
شائع کردہ: دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ ص ۴۲۱

[2] ائمہ فقہ کی تقنینی قابلیت مسلم۔ ان کا تقویٰ اور دیانت بھی شک و شبہ سے بالا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان ہی۔ انہیں مقامِ انسانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا شرک ہے۔

اجماع ہے۔ (بحوالہ۔ ایشیا۔ ۴ اگست ۱۹۶۸ء)

یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آرہا ہے۔

(۰)

(۱۱) یہ صورت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی کہ فطرت کی کرم گستری سے ہمارے ہاں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جو اقبال کے نام سے معروف ہے۔ اس کی نگہ بصیرت نے جب "عالمِ اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیا تو اس نے دیکھا

اقبالؒ کی نگہ بصیرت

ان میں کسی جگہ بھی نہ اسلامی حکومت قائم ہے نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں کارفرما۔ یہاں خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے رکھی ہے اور دین کی جگہ مذہب نے۔ اس نے اس کے خلاف جہاد کا عزم کیا اور ساری عمر اس پر قائم رہا۔ اس نے دیکھا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے رکھی ہے۔ (خلافت سے مراد ہے قرآنی نظامِ حکومت جو صدرِ اول میں قائم ہوا تھا) چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے خلاف نعرہ بلند کیا اور کہا کہ:

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

(ارمغانِ حجاز۔ ص۱۲۶)

اگلے صفحے پر لکھتے ہیں:۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا اور عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اسے اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے کہا تھا کہ:

درافتد با ملوکیت کلیمے — فقیرے، بے کلاہے، بے گلیمے
گہے باشد کہ بازیہائے تقدیر — بگیرد کارِ صرصر از نسیمے (ص۱۲۷)

اسے معلوم تھا کہ اس انقلابی نعرہ کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے میدانِ کارزار میں سامنے آئے گی۔ اقبالؒ کے کلام میں مُلّا کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مسلک اور وجود کے خلاف ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کر رہا تھا۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت، اس جنگ کا منفی پہلو تھا۔ اس کے مثبت پہلو کے سلسلہ میں اقبالؒ جانتا تھا کہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اسے عملی شکل میں سامنے نہ لایا جائے۔ اور ایسا کیا جانا ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مملکت میں پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اس میں اسلامی قوانین کس اصول کے مطابق مدوّن کئے جائیں۔ اس سوال کے ضمن میں انہوں نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور علاوہ دیگر مقامات، انہوں نے اپنے مشہور خطبات میں ایک پورا خطبہ اسی موضوع کے لئے وقف کر دیا۔ ہم اس خطبہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیشِ قارئین کرتے ہیں۔

خطبۂ اقبال کے اقتباسات

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــ تو اس سے زندگی جو اپنی نہایت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں، اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا، آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔"

ہم اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ (اپنے اسی خطبہ میں) لکھتے ہیں:۔

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر

کامیابی حاصل ہوتی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے کبھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں! اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افترا" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔

علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :۔

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت فقہ حنفی کے اٹھنے کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :۔

"امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :۔

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے اُن فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ معاملات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، علامہ اقبال کو اس کا احساس تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے اس نظریے کی شدت سے مخالفت ہو گی چنانچہ انہوں نے لکھا :۔

"مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہِ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول

دے گا۔ بایں ہمہ میں اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔"

اس سے بھی بہت پہلے انہوں نے (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (مرحوم) کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ "جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔" تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ امام اعظمؒ اپنے فتاویٰ کو کبھی ابدی اور غیر متبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔

نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا۔ "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا "ہاں"۔ اس پر امامؒ نے فرمایا "خیال رکھنا۔ تم بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔" (خطیب ج ۱۳ ص ۱۷۷)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابویوسفؒ سے فرمایا۔ یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابویوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا

مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطاکار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دیدو جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً ج ۱۳۔ صفحہ ۳۵۲) حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔" (ایضاً)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا نہیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے کہ:

محمود بن موسےٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحٰق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔

(بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۲۸۵)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادیؒ نے لکھا ہے:۔

ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچیے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۹۰)

امام اعظمؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس میں شک ہے کہ وہ ارشاد رسول اللہ کا ہے یا نہیں۔ آپ نے کہا یہ کہ اگر وہ رسول اللہ کا ارشاد تھا تو بھی وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

اصولِ قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ابدی اور غیر متبدل قرآن مجید کے احکام، اصول اور اقدار ہیں جنہیں وہ حدود اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ ہر اسلامی مملکت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریقِ کار خود متعین کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ ادوار کے قوانین سے بطور نظائر استفادہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر

استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (خطبات۔ تشکیلِ جدید۔ چھٹا خطبہ)

اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اسی اصول کے مطابق قوانین مرتب فرماتے اور اس طرح صدرِ اول کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کی ایک مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنا دیتے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ اس سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور اسلامی قوانین کے جس نظریہ اور مسلک کے خلاف انہوں نے اس قدر جہاد کیا تھا وہ یہاں غالب آگیا۔ اور اس خطۂ زمین کو اسلامی مملکت بنانے کا جو حسین خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خوابِ پریشاں بن کر رہ گیا۔

(۲)

لیکن اس خوابِ پریشاں کو اب بھی عملی حقیقت بنایا جا سکتا ہے۔ اگر ملک میں ایسے اربابِ دانش و بینش ہیں جو اسے عملی حقیقت بنانے کے آرزومند ہیں۔ تو وہ ان گذارشات سے راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے۔ اسلامی حکومت کی عمارت دو ستونوں پر استوار ہوتی ہے:۔

(۱) مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے مطابق سرانجام پائے گا۔ اور

(۲) اس کے عملی طریق اُمّت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔

قرآن کریم نے مشاورت کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب یہ مملکت پہلے پہل قائم ہوئی تھی تو اس امر کے فیصلہ کے لئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس لئے کہ اُس وقت پہلے وہ جماعت (مومنین) تیار کی گئی تھی جس کے ہاتھوں اس حکومت کا کاروبار سرانجام پانا تھا۔ وہ افراد، دل اور دماغ (سیرت اور فکر) دونوں اعتبار سے اس فریضہ کی ادائیگی کے اہل تھے۔ لیکن ہم نے جس قوم میں اس حکومت کی بنیاد رکھنی ہے، وہ تو ویسی نہیں۔ اس لئے اس میں اربابِ مشاورت کے انتخاب کے لئے معیار ہمیں خود متعین کرنا ہوگا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ:

(۱) ان ارکان میں، عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

(۲) یہ جاننے کی صلاحیت بھی کہ قرآن کریم ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ قدامت پرستانہ قرآن فہمی سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکے گی۔ ایسے حضرات کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔

(۳) یہ فیصلہ کرنے کی استعداد کہ ان دونوں کی روشنی میں، مملکت کا آئین اور ملک کے قوانین کس قسم کے وضع کئے جائیں۔ (قانون سازی کے سلسلہ میں سابقہ صفحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)۔ اور

(۴) ان کے ماضی کے متعلق کم از کم اتنی پڑتال کر لی جائے کہ وہ ایسا نہ ہو جس سے لوگوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہو اور ان پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔

(۵) حکومت انہیں معاش کی طرف سے بے فکر کر دے تاکہ وہ اپنا پورا وقت مملکتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وقف کر سکیں۔

اس مجلس مشاورت کی شکل (عصر حاضر کی سیاست کی رُو سے) پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ وہ ایک مکانی ہو یا دو مکانی۔ اس کی مدت حیات کس قدر ہو وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ اس لئے انہیں، ہم خود طے کر سکتے ہیں۔

یہ مجلس اپنے میں سے بہترین فرد کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے منتخب کر لے۔ اس کی شرائط بھی خود طے کی جا سکتی ہیں۔ ان میں بنیادی شرط یہ ہوگی کہ وہ کسی وقت بھی مشاورت سے بے نیاز ہو کر خود مختار نہ ہو سکے۔

چونکہ مجلس مقننہ ہو یا سربراہ مملکت، ان میں سے کوئی بھی قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکے گا، نہ ہی کوئی ایسا قانون وضع اور نافذ ہو سکے گا جو ان حدود سے ٹکرائے، اس لئے اس ادارہ یا سربراہ مملکت سے متعلق شرائط اور حدود کو چنداں اہمیت حاصل نہیں ہوگی۔ موجودہ (سیکولر) سیاست میں ان کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ انہیں بلا حدود و قیود قانون سازی کے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے سے اوپر کسی اتھارٹی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔ غور سے دیکھئے تو اسلامی مملکت کی پارلیمان، اعیان حکومت یا سربراہ مملکت کو کوئی اختیار حاصل ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف قرآنی احکام کے نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہوگا کہ مملکت کا کوئی اقدام قرآنی حدود (اس کے احکام۔ قوانین۔ اصول۔ اقدار) کے خلاف تو نہیں جاتا۔ اسلامی مملکت کی عمارت میں یہی بنیادی اینٹ ہے۔ صدر اوّل کی مملکت میں تو اس باب میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہاں تو ایک عام بڑھیا تک بھی جانتی تھی کہ معاملہ زیر نظر میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اس کی جرأت بھی حاصل تھی، (اور سربراہ مملکت کو اسے سننے کی ہمت بھی) کہ وہ قرآنی حدود سے تجاوز کر جانے والی تجویز کو برملا ٹوک سکے۔ لیکن ہمارے موجودہ حالات تو ایسے نہیں۔ ان میں ضروری ہے کہ سپریم کورٹ کی قسم کا کوئی ایسا ادارہ ہو جو ہر زیر بحث یا زیر عمل آنے والے معاملہ کے متعلق کہہ سکے کہ وہ قرآن کے خلاف تو نہیں۔ اور اس کے فیصلہ کو فوقیت حاصل ہو۔ کہا جائے گا کہ یہ تو تھیاکریسی ہی کی ایک شکل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ تھیاکریسی میں مذہبی پیشوائیت، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل اسلامی احکام قرار دے کر انہیں نافذ کرتی (یا کراتی) ہے۔ جس ادارہ کی تجویز ہم نے پیش کی ہے وہ نہ تو مذہبی پیشوائیت پر مشتمل ہوگا۔ اور نہ ہی وہ خارج از قرآن کسی فیصلہ کو خدائی فیصلہ قرار دے گا۔ وہ ان ارباب علم و بصیرت پر مشتمل ہوگا جن کی، قرآنی احکام و حقائق زمانہ پر گہری نظر ہو۔ وہ اپنی رائے کو قرآنی اسناد اور علمی دلائل کی رُو سے پیش کریں گے۔ صدر اوّل کی مملکت میں اس قسم کا ادارہ تو کوئی نہیں تھا، کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن امور مملکت کے فیصلے اسی اصول کے

مطابق ہوتے تھے۔ اس ضمن میں عہدِ فاروقیؓ میں عراق کی زمینوں کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ امیرالمؤمنین کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ بعض صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ اس مسئلہ پر مجلسِ مشاورت میں جو تقاریر ہوئی ہیں ان سے ہویدا ہے کہ اختلافی معاملات میں اظہارِ خیالات کی کس قدر آزادی تھی ـــــ حضرت عمرؓ نے اپنی تجویز کو پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں، بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ ..... میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے، اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطقِ بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔

(شاہکارِ رسالت ـــــ صفحہ ۳۸۵)

اس کے بعد، قرآن مجید پر غور و فکر کے لئے بحث کو ملتوی کر دیا گیا۔ جب دوبارہ اجلاس شروع ہوا، تو آپ نے کہا کہ للہ الحمد کہ قرآن پر گہری سوچ کے بعد مجھے وہ آیت مل گئی ہے جو اس باب میں قولِ فیصل ہے۔ آپ نے اسے پیش کیا تو سب نے اسے تسلیم کر لیا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ ہوا (کہ یہ زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں گی)۔

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق اسلامی مملکت میں اختلافی امور کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس میں قولِ فیصل خدا کی کتاب ہوتی تھی، نہ کہ کسی کی رائے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت مت بناؤ"۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۲۷۵)

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق اس دور میں معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ ہم نے جو ایک ادارہ کی تجویز پیش کی ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کی رائے کو قولِ فیصل قرار دے دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ قرآن کا فیصلہ سامنے لا سکے۔ جب افرادِ اُمت کو ایسی قرآنی بصیرت حاصل ہو جائے جیسی صدرِ اوّل کے افرادِ اُمت کو حاصل تھی تو پھر اس قسم کے الگ اداروں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

(۰)

یہ ہیں اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی خط و خال، قرآن کی روشنی میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے بھی بڑی جرأت اور ہمّت کی ضرورت ہوگی۔ جس مملکت میں نہ مذہبی فرقوں کا وجود باقی رہے، نہ ان کی فقہ کا۔ جس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی کوئی تفریق و تخصیص نہ ہو، اور قوانینِ مملکت کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔ جس میں نہ کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوں، نہ لامحدود اراضی کے رقبات۔ مختصر الفاظ میں، جس مملکت میں نہ کوئی فرعون ہو، نہ ہامان، نہ قارون، اس کی بنیاد رکھنے کے لئے کس قدر جرأتِ ایمانی کی ضرورت ہوگی، یہ ظاہر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مملکت بتدریج اپنے منتہیٰ تک پہنچے گی لیکن اس منتہیٰ (منزل) تک لے جانے والے راستہ میں بھی پھولوں کی گلگشت نہیں ہوگی۔ کانٹوں کی آبلہ پائی ہوگی۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے اس مملکت کا تصور پیش کرنے کے بعد کہا تھا کہ اس کی ابتدا وہی کر سکے گا جو عمرؓ کی سی جرأت کے ساتھ کہہ سکے کہ

"حسبنا کتاب اللہ"

لیکن اگر کسی میں اس کی ہمّت نہ ہو، تو ہم بصد ادب گذارش کریں گے کہ وہ جس قسم کی جی چاہے حکومت قائم کرے لیکن اسے اسلامی حکومت نہ کہا جائے۔ اسے مسلمانوں کی حکومت کہا جائے۔ مسلمانوں کی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں کہہ کر، ہم اسلام کو کافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ اس سلسلہ کو کہیں تو ختم ہونا چاہیئے!

اگر علامہ اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ اس قسم کی حکومت کی داغ بیل ڈال سکتے تھے۔ اقبالؒ کے نظریات تو آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں اسلامی حکومت کا تصور کس قدر روشن اور بالے آمیز تھا اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد۔ دکن) کے طلبا کے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ اسلامی حکومت کی خصوصیت کیا ہوگی؟ آپ نے فرمایا تھا:-

> اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

وہ بار بار اعلان کر چکے تھے کہ "پاکستان میں کسی صورت میں تھیاکریسی نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔" اس کے ساتھ ہی ان کے حسنِ کردار کی بنا پر قوم کو ان پر ایسا اعتماد تھا کہ ان کے پیش کردہ آئینِ مملکت کی کوئی بھی مخالفت نہ کرتا۔ لیکن وہ اگر نہیں رہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی مامور من اللہ نہیں تھے۔ انسان ہی تھے۔ اور اس قسم کے انسان پھر بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

—(۰)—